انتخاب

قرآن مجید کے مطابق اس دنیا میں انسان جس امتحان میں ہیں، وہ کسی قسم کا جبر نہیں بلکہ ان کا اپنا انتخاب ہے، (احزاب 72:33)۔ اس دنیا کا امتحان چونکہ اخلاقی نوعیت کا ہے اس لیے اخلاقی معاملات میں انسانوں کے پاس یہ اختیار ہر حال میں موجود رہتا ہے کہ وہ خیر کو چنتا ہے یا شر کو۔ نیکی کو چنتا ہے یا بدی کو۔ دیانت کو چنتا ہے یا بددیانتی کو۔ انسان کا یہی وہ اختیار ہے جس کے نتیجے میں جنت یا جہنم میں سے کوئی ایک منزل انسان کا ابدی مستقر بن جائے گی۔

جنت کی ابدی زندگی، لافانی عیش وعشرت، لازوال حسن وشباب، غیر منقطع نعمتیں، غیر ممنوع لذتیں، بے حساب انعام، بے شمار اکرام؛ غرض ہر وہ چیز جس کا انسان تصور کر سکتا ہے، اس ابدی ٹھکانے پر انسان کی منتظر ہیں۔ اس کے برعکس انسان کو دوسرا ممکنہ ٹھکانہ جہنم کا ختم نہ ہونے والا عذاب اور برداشت نہ ہونے والی سختیاں ہیں۔

تاہم یہ بات نظریاتی پہلو سے کہی اور لکھی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم اپنی ذات میں ایک ناقابل انتخاب جگہ ہے۔ اس انسان کے لیے جو لو کی تپش نہ جھیل سکے، آگ کی لپٹ کیسے کوئی انتخاب بن سکتی ہے۔ جو انسان سوئی کی چبھن برداشت نہ کر سکے، اس کے لیے لمحہ میں شکلیں بدل کر جسم اور دماغ کو توڑ دینے والے عذاب سرے سے کوئی چوائس نہیں ہیں۔

جس انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے سامنے دو ہی ممکنہ انجام ہیں اور اس میں سے دوسرا انجام درحقیقت کوئی چوائس ہی نہیں وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ انسان کے وجود سے پھوٹنے والی ساری نیکی اسی تڑپ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کا سارا تقویٰ اسی احساس کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مگر جو بدنصیب اس حساس کے بغیر جیتے ہیں وہ گناہ اور اخلاقی پستی کو اپنا انتخاب بناتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر جہنم کا وہ انجام ان کا مقدر بن جاتا ہے جو کسی صورت کوئی انتخاب نہیں۔

پتھریلا راستہ

قرآن کریم میں سو سے زائد مقامات پر صبر کا ذکر ہے۔صبر اتنی بڑی چیز ہے کہ اسے جنت میں جانے کا ذریعہ (الدہر 12:76، الرعد 22:13)، اجر بے حساب (الزمر 10:39) کی وجہ اور معیت الٰہی کا سبب (البقرہ 153:2) قرار دیا گیا ہے۔

صبر کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ یہ ایمان لانے کے بعد اس کے تقاضوں پر جمے رہنے، راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے، زندگی کے آزمائشوں کو رضائے الٰہی کے لیے حوصلے سے جھیلنے اور دعوت حق کے مخالفین کے بیہودہ پروپیگنڈے کے مقابلے میں تحمل اور برداشت سے کام لینے کا نام ہے۔

مذکورہ بالا تمام مواقع پر انسان کو ایک طرف خارجی محرکات کے مقابلے میں اپنے نفس پر قابو پانا ہوتا ہے تو دوسری اپنے اندر پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ کو برداشت بھی کرنا ہوتا ہے۔ پہلے کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک نوجوان کے سامنے جب کوئی فحش منظر آئے تو اسے اپنے آپ سے جنگ کرکے خواہش نفس پر قابو پانا ہوگا۔ایک اور مثال گہری نیند سے بیدار ہوکر فجر کی نماز پڑھنا ہے۔ اس کے لیے بھی خود سے لڑنا پڑتا ہے۔جبکہ اپنے اندر کے غصے اور جھنجھلاہٹ کو برداشت کرنے کی ایک مثال بیماری یا کاروباری نقصان پر خود کو تلخی اور شکوے شکایت سے روکنا ہے۔ایک اور مثال کسی شخص کا آپ کو گالی دینا ہے۔اس کے جواب میں غصہ آنا ایک فطری امر ہے۔مگر جواب میں خود کو گالی دینے سے روکنا اور اپنی توہین برداشت کرلینا بڑی ہمت کا کام ہے۔اسی طرح ایک داعی کے لیے جھوٹے پروپیگنڈے اور الزام و بہتان کی یلغار میں صبر سے کام لینا بلاشبہ پیغمبرانہ حوصلے کا کام ہے۔

صبر کا راستہ پتھریلا ہے۔مگر اس کی منزل جنت کے ابدی باغ ہیں۔ایک صابر شخص جب وہاں پہنچے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ راہ کا ہر پتھر ایک پھول تھا جس سے اس کی زندگی مہک اٹھی ہے۔

مال اور حق پرستی

قرآن مجید میں انفاق کے ضمن میں سورہ بقرہ (265:2) میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہ اہل ایمان اپنا مال اللہ کی رضا اور اپنے آپ کو راہ حق پر جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی رضا والی بات تو بالعموم لوگوں پر واضح ہے لیکن یہ بات کہ مال خرچ کرنا راہ حق پر انسان کو استقامت دیتا ہے وضاحت طلب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال ہر دور میں دنیا کے قائم مقام رہا ہے۔ خواہش اور خواب کو حقیقت کا روپ دینے والے شے مال و دولت ہی ہے۔ انسان مال سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کا جھمگٹا اپنے گرد اکھٹا کر سکتا ہے۔ تاہم کسی کے پاس لامحدود مال نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ہر خواہش پوری کر سکے۔ اور اگر مال ہو تب بھی بہت کچھ حاصل کرنے کی دوڑ میں انسان حلال و حرام کی حدود کو فراموش کر سکتا ہے۔

یوں انسان اگر مال سے مقصود صرف یہ بنالے کی اسے اپنی ہر خواہش پوری کرنی ہے تو جلد یا بدیر وہ راہ حق سے ڈگمگا جائے گا۔ لیکن جو لوگ اپنے مال دوسرے انسانوں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ گویا اپنی تربیت کرتے ہیں کہ ان کے مال پر ان کی خواہشات ہی کا نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی ضروریات اور اللہ کے دین کے تقاضوں کا بھی حق ہے۔

یوں نفس اور خواہش کے بے لگام گھوڑے کو انفاق کے چابک سے قابو کیا جاتا ہے۔ دوسروں پر خرچ کر کے انسان خود کو یہ سمجھاتا ہے کہ میری خواہشات کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسروں کی ضروریات شروع ہوتی ہیں۔ انسان خود کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے جہاں میرا مال سات سو گنا تک بڑھا کر مجھے دے دیا جائے گا۔ اس روز میرا لگایا ہوا یہ درخت وہ پھل دے گا جو کبھی ختم نہ ہوں گے۔ یہی سچی حق پرستی ہے جو انفاق سے پیدا ہوتی ہے۔

نجات والا ایمان

احادیث کی کتابوں میں کتاب الایمان میں ایک مضمون متعدد طریقے سے آیا ہے۔ان احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان لانے والوں کو جنت میں داخلے اور جہنم سے نجات کی خوش خبری دی ہے۔بعض روایات میں تو یہ وضاحت موجود ہے کہ ایسا مومن زنا اور چوری کرنے کے باوجود جنت میں جائے گا،(قال وان زنی و ان سرق،متفق علیہ)۔

ان روایات کو سمجھنے میں لوگوں کر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ بظاہر یہ روایات اس عمل صالح کی نفی کر دیتی ہیں جو قرآن مجید اور دیگر احادیث کے مطابق جنت کی لازمی شرط ہیں۔تاہم ان روایات کا اصل مدعا اگر واضح ہو تو پھر بات سمجھنی مشکل نہیں۔ یہ روایات عمل صالح کی نفی نہیں کرتیں نہ لوگوں کو بد عملی، زنا اور چوری وغیرہ کی چھوٹ دے رہی ہیں۔ بلکہ درحقیقت یہ ہر طرح کے تعصب سے بلند ایمان کی عظمت کا بیان ہیں۔ یہ ایمان اپنی ذات میں اتنا بڑا عمل ہے کہ نہ صرف پچھلے بلکہ اگلے سارے گناہ بھی معاف کروا دیتا ہے۔

ان روایات کے اصلی مخاطب دراصل صحابہ کرام ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے شرک جن کا آبائی دین تھا۔ان کے تعصّبات خدائے واحد کے بجائے بتوں سے وابستہ تھے۔ یہ کلمہ توحید پڑھتے تھے نہ نبی کے نام کے ساتھ درود پڑھتے تھے۔ایک اللہ کی عبادت ان کے لیے انتہائی اجنبی تصور اور بتوں کو چھوڑنے کا تصور ان کے لیے باعث وحشت تھا۔مگر جب نور نبوت کی روشنی پھیلی تو یہ تعصب کی ہر دیوار کو ڈھا کر ایمان لے آئے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدترین پروپیگنڈا اور ان کے ماننے والوں پر ظلم شروع ہو گیا۔آپ کی دعوت سے لوگوں کو دور کرنے کے لیے ایسے ایسے نکتے ایجاد کیے گئے کہ عقل حیران رہ جائے۔مثلاً کہا گیا کہ قرآن کریم گھر بیٹھ کر گھڑا جاتا ہے۔الزام لگایا گیا کہ رومی اور عجمی غلام یہ کتاب

املا کراتے ہیں۔ یہ القائے شیطان ہے۔ یہ شاعری اور تک بندی کے سوا کچھ نہیں۔ پچھلوں کی کہانیاں ہیں۔ اس شخص پر جادو ہو چکا ہے۔ یہ دوسروں پر جادو کر دیتا ہے۔ خاندانوں میں جدائی ڈلوا دیتا ہے۔ یہ نبی نہیں ایک مجنون ہے۔ ہم اس کی بات مانیں گے تو عرب سے ہمارا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اسے ماننے والے پر بتوں کی لعنت ہو گی۔ یہ سچا ہے تو پچھلے نبیوں کی طرح عصا سے سانپ اور مردہ سے زندہ کیوں نہیں نکالتا۔ اس پر خزانے کیوں نہیں اترتے۔ فرشتے اس کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ یہ مستقبل کے واقعات جان کر خود کو نقصانات سے کیوں نہیں بچا لیتا۔ اس کا خدا ہم سے براہ راست کلام کیوں نہیں کرتا۔ یہ سردار ہے نہ امیر تو اس میں ایسی کیا خوبی ہے کہ ہم کو چھوڑ کر اس پر وحی نازل کی گئی۔ یہ ہمارے اسلاف اور آبا و اجداد سے ہٹ کر ایک نئے راستے کی طرف بلا رہا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اگر یہ سچا ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں لے آتا۔

گستاخ رسول اور منکر حدیث کی اصطلاح تو آج کے مسلمانوں نے اپنے مخالفین کو بدنام کرنے کے لیے ایجاد کی ہیں، مگر گستاخی رسول اور انکار رسول کا کون سا طریقہ تھا جو اس دور میں استعمال نہیں کیا گیا۔ ایسے میں ''جادوگر، مجنون اور شاعر'' کا خطاب پانے والے کی بات کون سنتا اور کون آبا و اجداد کے طریقے پر تنقید کرتی کتاب پر ایمان لا کر خود کو مصائب کی بھٹی میں جھونکتا۔ اتنے ''مضبوط'' دلائل کے بعد کون بازاروں میں چلتے پھرتے اپنے جیسے ایک بشر پر ایمان لا کر اسے نبی تسلیم کرتا۔ باخدا ہمارے جیسے آج کے مسلمان ہوتے تو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایمان لانے کے بجائے کفار کی صف میں جا کر کھڑے ہو جاتے۔ ہم بتوں کے پکے ماننے والے بنے رہتے۔ اپنے گھر والوں کو ایمان لانے سے روکتے۔ صادق و امین کے خلاف جھوٹ بولتے اور پوری بے حیائی سے جھوٹ پھیلاتے۔ ایمان لانے والوں کو مارتے پیٹتے اور اپنے آبائی دین کی طرف انہیں واپس لانے کی کوشش کرتے۔ اس کے ساتھ اپنی حق پرستی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے۔

لیکن یہ صحابہ کرام کی عظمت تھی کہ وہ ان سارے حالات کے باوجود نہ صرف ایمان لائے بلکہ ہر طرح کے ظلم کے باوجود اس ایمان پر ڈٹے رہے۔انہوں نے پروپیگنڈے کی اس کالی آندھی کے باوجود اندھا بنے رہنے سے انکار کردیا۔مخالفت کے ہر طوفان کے باوجود داعی حق کی پکار پر بہرہ بننے سے انکار کردیا۔نفرت کے ہر سیلاب کا سامنا کرکے رب واحد کی بندگی کی شاہراہ کو چھوڑنے سے انکار کردیا۔

ان کا ایمان ان کا پیدائشی عقیدہ نہیں تھا بلکہ ان کی زندگی میں کیا جانے والا سب سے بڑا عمل بھی تھا۔اپنے تعصّبات کے خلاف ایمان لانے کا یہ عمل اتنا بڑا تھا کہ اس کے نتیجے میں ان کے ہر سابقہ گناہ کو معاف کردیا گیا۔اپنے جذبات کے خلاف ایمان لانا اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ جذبات میں آکر ان سے کسی گناہ کا ارتکاب ہوجاتا۔لیکن باخدا سرکار دو عالم، محسن انسانیت اور کائنات کے سب سے بڑے عارف نے بالکل درست کہا کہ اس کے بعد اگر زنا اور چوری بھی ہوجائے تو یہ گناہ ایسے ایمان لانے والے کو کسی صورت جنت میں جانے سے نہیں روک سکتا۔باخدا ایمان کے اس من کے آگے زنا کا تولہ اور چوری کا ماشہ کیا وزن رکھتا ہے۔اس عمل کے بعد کوئی عمل اتنا نقصان دہ نہیں رہتا کہ انسان کو جنت سے محروم کردے۔

باخدا میرے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات بالکل درست ہوتی ہے۔آپ ان روایات میں یہ نہیں بتا رہے کہ عمل صالح کی کوئی حیثیت نہیں ۔آپ یہ نہیں بتا رہے کہ زنا اور چوری کرنا چھوٹی چیزیں ہیں۔آپ یہ بتا رہے ہیں کہ اپنے تعصّبات کے خلاف جا کر ایمان لانا اتنا بڑا عمل ہے کہ اس کے مقابلے کا کوئی عمل اس کائنات میں موجود نہیں۔

آہ مگر یہ کیسا عجیب سانحہ ہے کہ آج نبی کے نام لیوا بہت ہیں۔مگر صحابہ کرام کی طرح تعصب کی ہر زنجیر کو کاٹ کر ایمان کا طوق پہننے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

مسلمان کیوں متحد نہیں؟

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں جو نعرہ سب سے زیادہ مقبول رہا ہے وہ مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ ہے۔ جمال الدین افغانی (1838-1897) کے پان اسلامائزیشن سے لے کر موجودہ دور کی احیائے خلافت تک کی تحریکوں تک سب کا مرکزی خیال یہی خواہش ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان متحد ہو جائیں اور دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام بحال کریں۔

یہ خواہش یا خیال اپنی ذات میں بہت محمود ہے۔ مسلمانوں کے اتحاد اور دنیا پر ان کے اقتدار کا کون مخالف ہوسکتا ہے۔ مگر انیسویں صدی سے آج تک یہ خواہش ایک خواب ہی بنی رہی ہے اور نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر مسلمان درجنوں ریاستوں میں اپنے اپنے سیاسی، تہذیبی، سماجی اور مسلکی اختلافات کے ساتھ منتشر ہیں۔

اس کے برعکس جدید دنیا میں لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ ہزاروں سال سے بہت سی ریاستوں میں منقسم اور شدید ترین نوعیت کی باہمی جنگوں اور رقابتوں کا شکار یورپ، یورپی یونین کی شکل میں بتدریج ایک اکائی بننے کی سمت میں اپنا سفر کامیابی سے طے کر رہا ہے۔

جمال الدین افغانی جیسے داعی، علامہ اقبال جیسے مفکر اور شاعر، حسنا البنا جیسے مرشد، مولانا مودودی جیسے مصنف، اخوان اور جماعت اسلامی جیسی منظّم جماعتوں اور احیائے خلافت کی متعدد تحریکوں کی موجودگی، عربوں کی بے پناہ دولت اور مسلمانوں کی مسلسل خواہش کے باوجود یہ خواب ہنوز اپنی تعبیر سے محروم ہے تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی وہ الٹی تربیت ہے جو امت مسلمہ میں اتحاد تو کیا پیدا کرے گی، جو تھوڑا بہت اتحاد مسلمانوں میں باقی ہے، اس کو بھی تقسیم در تقسیم کیے جا رہی

ہے۔ یہ الٹی تربیت اپنے تعصّبات سے جکڑے رہنے اور اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کی تربیت ہے۔ ہمارا سانحہ یہ ہے کہ جو لیڈر اور بڑا آدمی پیدا ہو جاتا ہے وہ باتیں تو اتحاد و اتفاق کی کرتا ہے لیکن کچھ ہی عرصے میں اس کی اپنی شخصیت، اپنی جماعت، اپنا فرقہ، اپنا گروہ عین مطلوب بن جاتا ہے جس سے اختلاف رائے کرنا ممکن نہیں رہتا۔

آپ کسی شخصیت سے وابستہ ہو جائیں تو اس سے اختلاف رائے کرنا ایک جرم بن جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اس کے ساتھ مل کر کوئی کام کرسکیں۔ آپ کسی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں تو اس کا پہلا مشن آپ کی انفرادیت کو کچل کر اپنا ذہنی لونڈی غلام بنانا ہوگا۔ آپ مزاحمت کریں گے تو یہ گروپ آپ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ آپ کسی مسلک میں پیدا ہو گئے ہیں تو ذرہ برابر اختلافی بات آپ کو بددین اور گمراہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی ذہین اور باصلاحیت آدمی کسی اجتماعیت سے وابستہ نہیں رہ پاتا۔ نتیجتاً وہ ہر طرح کے وسائل سے محروم ہو کر اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جو لوگ باقی رہتے ہیں ان کے پاس وسائل بہت ہوتے ہیں صلاحیت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے بے صلاحیت لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے۔ ہاں وہ دین کے کام کو دوکانداری میں ضرور تبدیل کر دیتے ہیں۔

باقی جو کوئی باصلاحیت آدمی کسی طور اپنی الگ شناخت بنانے لگتا ہے اس کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں تعصب کا زہر جو پہلے ہی معاشرے کو تقسیم کیے ہوئے ہے وہ مزید نئی تقسیم پیدا کر دیتا ہے۔ تعصب کا شکار یہ شخص اگر بہت باصلاحیت ہے تو تھوڑے عرصے میں اپنی شناخت پیدا کر لیتا ہے، مگر پھر وہی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کا مرض اسی نئے گروہ اور جماعت میں جنم لے لیتا ہے اور پھر ایک دفعہ وہی کہانی شروع

ہو جاتی ہے۔

اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بتدریج مسلمانوں میں یہ رویے گہرے ہوتے چلے جارہے ہیں۔ مثلاً جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی صلاحیت اپنی جگہ مگر ان کے دور میں یہ رویے اس قدر شدید نہ تھے۔ جمال الدین افغانی اگر آج زندہ ہوتے تو اہل تشیعہ کے ایجنٹ کہلاتے۔ علامہ اقبال پر گرچہ ان کی زندگی ہی میں کفر کا فتوی لگ گیا تھا، مگر آج کے دور میں ہوتے تو ان کے خلاف اتنا شدید پروپیگنڈا ہوتا کہ ''کافر اور گمراہ اقبال'' کے اشعار پڑھنے کے بجائے لوگ ان کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ لگا لیتے۔ مولانا مودودی بھی گرچہ اپنی زندگی میں ''امریکہ کا ایجنٹ'' اور ایک عظیم ''فتنہ'' ہونے کا خطاب پا چکے تھے، مگر اِس دور میں ہوتے تو طبعی عمر پوری کرنے کے بجائے کسی خودکش حملے میں جام شہادت نوش کر چکے ہوتے۔

اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ مسلمانوں میں تعصب اور اختلاف رائے کو مٹا دینے کی سوچ کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ سوچنے والے باصلاحیت اذہان اختلاف رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ یہ کرتے رہیں گے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ تعصب ایک زہر ہے۔ یہ زہر جس کے دماغ میں پکتا ہے آخر کار اسی برتن کو کھا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ خود قوم وملت کے لیے بھی تباہ کن ہے۔ یہ مسلمانوں کے اتحاد کا سب سے بڑا قاتل ہے۔ اس کی موجودگی میں مسلمانوں کے اتحاد کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اتحاد پیدا کرنا ہے تو اختلاف رائے کو برداشت کرنا ہوگا۔ امت کو ایک کرنا ہے تو تعصب کو جڑ سے اکھاڑنا ہوگا۔ ان چیزوں کے بغیر اتحاد کا راگ کتنا بھی الاپا جائے عملی زندگی میں کبھی معنی خیز تبدیلی نہیں لاسکتا۔

ریحان احمد یوسفی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں لونڈی رکھنے کی وجہ

[ماہ اکتوبر میں غلامی کے حوالے سے ابو یحییٰ صاحب کی تحریر پر ایک اہم سوال یہ کیا گیا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ایک لونڈی کیوں موجود رہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب ایک پرانے خط میں دیا جا چکا ہے جو انھوں نے اپنے ایک دوست مبشر نذیر صاحب کو لکھا تھا۔ خط و کتابت کا موضوع مبشر نذیر صاحب کے ایک دوست کے وہ سوالات ہیں جو انھوں نے 'غلامی اور اسلام کے کردار' کے حوالے سے اٹھائے تھے۔ یہ خط و کتابت انگریزی زبان میں ہوئی ہے جسے رضوان انور صاحب نے رسالے کے لیے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے خط کا متعلقہ حصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ]

محترم اور پیارے دوست مبشر

السلامُ علیکم!

آپ نے مجھ سے بھائی محسن کے سوالات کے جوابات دینے کی درخواست کی ہے۔ اس لیے اُن کے سوالوں میں جو دو اہم نکات اٹھائے گئے ہیں اُن کے جواب حاضر خدمت ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے اِس بات سے اتفاق کیا کہ اصولی طور پر قرآن و سنت کو اس پر کوئی اعتراض یا ناپسندیدگی نہیں تھی کہ اُس وقت جو لونڈیاں پہلے سے موجود تھیں اُن کے ساتھ مالکان تعلق زن و شو قائم کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات سے قطع نظر کہ نئے غلام بنائے جا سکتے ہیں یا نہیں، اسلام کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کیا آپ کو یہ عمل ایک دن کے لیے بھی

ایک سخت ظالمانہ فعل محسوس نہیں ہوتا؟''

بھائی محسن کا بنیادی مسئلہ دراصل میری نظر میں یہ ہے کہ انہوں نے پہلے سے کچھ اصول طے کر رکھے ہیں، ایک خاص رائے قائم کر لی ہے اور پھر وہ اعتراضات اُٹھاتے ہیں۔ وہ اکیسویں صدی کی غلامی کے تصور سے ناآشنا دنیا میں کھڑے ہیں جو کہ پرانے زمانے سے بالکل مختلف ہے اور غالباً وہ اُس غلامی کے دور کی رائج تلخ حقیقتوں سے بھی ناآشنا ہیں۔

اب ہم اُن کے اس نکتے کا جائزہ لیتے ہیں جو بنیادی طور پر اس مفروضے پر کھڑا ہے کہ اُس دور میں تمام لونڈیاں خوبصورت تھیں اور اُن کا مقصد صرف جنسی تسکین حاصل کرنا تھا۔ ہماری نظر میں اس دور کے بارے میں یہ مفروضہ قطعی غلط ہے۔ دراصل اس دور میں غلامی کا ادارہ کال گرل قسم کی چند حسین لڑکیوں پر مشتمل نہیں تھا بلکہ لونڈی اور غلام اس دور کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کا ایک مکمل اور لازمی حصہ تھے اور معاشرے کے لیے اُن کے بغیر قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ جس طرح آج ہم اپنے اس صنعتی دور میں مزدوروں اور ملازموں کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح غلام اس دور کی معاشرت کی ایک بنیاد تھے۔ یہ غلام ہر عمر کے ہوتے تھے اس لیے کہ وہ اپنی پیدائش سے موت تک وہیں ہوتے تھے اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا عمل دخل تھا۔ وہ اپنے مالکان کی خدمت پر معمور ہوتے تھے اور یہ مالکان کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ ان کی تمام تر بنیادی ضروریات پوری کریں۔ جیسے حفاظت، رہنے کے لیے جگہ، کھانا پینا اور کپڑے وغیرہ۔ اس طرح یہ مالکان اُن کے محافظ اور ضروریات مہیا کرنے والے ہوتے تھے اور یہ غلام اُن کے خدمت گذار۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ یہ ایک بالکل انصاف پر مبنی نظام تھا بلکہ میں صرف اس نظام کی صورتحال واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو کہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ میں اس بات پر پھر زور دونگا کہ یہ نظام صدیوں بلکہ ہزاروں برس سے اسی طرح چلا

آرہا تھا۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تصور درست نہیں کہ قدیم معاشرے میں غلامی کے نام پر چند حسین لونڈیاں ہوا کرتی تھیں اوران کا مقصد جنسی تسکین کا حصول تھا۔

یہاں ایک اور بہت اہم بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ اسلام نہیں تھا جس نے غلامی کا آغاز کیا بلکہ اسلام کو تو یہ وراثت میں ملی تھی اوران حالات میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ بس ایک دن یہ اعلان کر دیا جائے کہ آج سے تمام غلام آزاد ہیں۔اگر ایسا کیا جاتا تو جو بدنظمی اس سے وجود میں آتی اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔اگر اسلام اُس وقت یہ قدم اٹھاتا تو اس کے نتیجے میں فقیروں، رہزنوں، چوروں اور طوائفوں کے جھنڈ معاشرے میں ہر جگہ پھیلے نظر آتے۔اس لیے اسلام نے مکمل اورفوری تبدیلی کے بجائے ایک تدریجی تبدیلی کا راستہ اختیار کیا اور سب سے پہلے جنگوں میں نئے قیدی غلام بنانے پر پابندی لگا دی اور پھر مکاتبت کے ذریعے سے پہلے سے موجود غلاموں کے لیے آزادی کا دروازہ کھولا۔مکاتبت قرآن مجید کا وہ قانون ہے جس کے تحت کوئی لونڈی یا غلام اپنی قیمت ادا کر کے اپنے مالک سے آزادی حاصل کر سکتا تھا۔

اب اس تمام پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھائی محسن کے اس اعتراض کو لیتے ہیں کہ لونڈیوں کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کرنا ایک ظالمانہ فعل تھا۔یہی بات انہوں نے مجھ سے فون پر بھی دریافت کی تھی اور میں نے ایک سادہ سا جواب دیا تھا۔میں نے ان سے پوچھا کہ اگر ان کے مالکان کا ان سے یہ تعلق قائم کرنا اُن کی نظر میں ظالمانہ فعل تھا تو پھر اُنہوں نے مکاتبت کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔اس پر انہوں نے سوال کیا کہ کیا ایسا تاریخ میں کبھی ہوا۔تو میں نے ان سے کہا کہ کیا تاریخ میں اسکے برعکس کبھی ہوا یعنی میرا مطلب یہ تھا کہ کیا تاریخ میں کبھی ایسا واقعہ بیان ہوا کہ کسی لونڈی نے اس وجہ سے مکاتبت کا مطالبہ کیا ہو کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ اس تعلق کو قائم کرنا ظلم سمجھتی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے

راشدین میں سے کسی نے انکار کیا ہو۔تاریخ میں ایسے کسی واقعہ کا نہ ملنا یہ بتاتا ہے کہ اس دور میں لونڈیاں اس بات کو ظلم قطعی نہیں سمجھتی تھیں۔بالکل اسی طرح جیسے آج کوئی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنا غلط نہیں سمجھیں گی اور کوئی بھی اس بات کو ظالمانہ فعل یا غلط تصور نہیں کرے گا۔ہاں البتہ اس دور میں جو چیز غلط سمجھی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ غلام لونڈیوں کو قحبہ گری کا پیشہ کرنے پر مجبور کیا جائے جس کی اسلام نے سختی سے ممانعت کر دی۔سورۂ نور (33:24)

اسی سورہ میں (32:24) قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ مالکان اپنی لونڈیوں کے نکاح کا انتظام کریں۔لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ ان لونڈیوں کو معاشرے میں اتنا کمتر سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بھی ان سے نکاح کرنا معیوب سمجھتا تھا اور مزید یہ کہ وہ اخلاقی کردار میں بھی کچھ بہتر مقام پر نہیں ہوتی تھیں۔یہ بات ہمیں سورۂ نساء (25:04) سے معلوم ہوتی ہے جہاں قرآن نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ لوگ اپنی لونڈیوں سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی اُنہیں اخلاقی تربیت کے پیش نظر یہ رعایت بھی دیتا ہے کہ اگر نکاح کے بعد ان سے زنا کا ارتکاب ہو جائے تو ان کی سزا ایک آزاد کے مقابلے میں آدھی ہوگی۔

ایک لونڈی کے لحاظ سے اُسکے لیے سب سے بہتر یہ تھا کہ اُسکا مالک ہی اس سے نکاح کر لے۔لیکن اگر وہ ایسا نہیں چاہتا تو کیا اُسے کسی غلام مرد سے نکاح کرنا چاہیے؟ جی ہاں کچھ نے ایسا کیا بھی مگر ان میں سے بیشتر لونڈیوں کے خیال میں یہ زیادہ بہتر تھا کہ وہ اپنے مالک کے بیٹے کی ماں بنیں جو کہ معاشرے کا ایک اہم شخص ہوگا بجائے اس کے کہ کسی مرد غلام سے نکاح کر کے اس کے بیٹے کی ماں بنیں جو کہ معاشرے میں ایک غلام ہی کا بیٹا کہلائے گا۔آج کے ایک مسٹر پرفیکٹ (Mr.Perfect) کو یہ بات سمجھنے میں شاید مشکل ہو سکتی ہے لیکن اس دور کی ایک لونڈی یہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اُس نے کسی کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کرنا ہی ہے تو بہتر

انتخاب اس کا مالک ہے جو کہ اسے بہتر تحفظ بھی دے سکتا ہے اور اسکی تمام ضروریات بھی پوری کر سکتا ہے۔ یہاں میں ایک مرتبہ پھر زور دے کر دہرانا چاہتا ہوں کہ اس کے باوجود اگر کوئی لونڈی آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی تو اُس کے لیے مکاتبت کا دروازہ کھلا تھا جو غلامی کا خاتمے کا سب سے بہتر طریقہ تھا۔

بھائی محسن مزید فرماتے ہیں کہ ''آپ کہتے ہیں کہ یہ معاملات ہمیں آج کے دور میں بڑے معیوب معلوم ہوتے ہیں لیکن اس دور میں معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ بات ایک عام آدمی کے لحاظ سے تو قابل قبول ہے لیکن ایک پیغمبر کے لیے اور ایک ایسے دین کے لیے جس کا دعویٰ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو ہر بات کا جاننے والا اور ہر دور کے حالات سے واقف ہے اور اس کی طرف سے صرف حق ہمیں ملتا ہے یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ اس لحاظ سے تو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر کو اِسے دین کی روح کے خلاف سمجھتے ہوئے اس کا خاتمہ کرنا چاہیے تھا۔''

میرا خیال ہے کہ یہاں بھائی محسن کی مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں بھی ایک لونڈی تھیں جن کا نام ماریہ قطبیہ تھا اور بھائی محسن یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کے پاس ایک غلام لونڈی کا ہونا سمجھ نہیں آتا۔ پیچھے میں جو وضاحت کر چکا ہوں اس سے یہ بات سمجھ آجانی چاہیے لیکن یہاں میں مزید وضاحت کیے دیتا ہوں۔ دیکھئے زنا بالجبر یا کسی کی آبروریزی کرنا یہ تو ہر دور میں بلا تخصیص نہایت ظالمانہ فعل ہی سمجھا جائے گا لیکن کیا آج کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کرے تو اس کو ظالمانہ اور معیوب سمجھا جا سکتا ہے؟ قطعی نہیں۔ اسی طرح اس دور میں غلام لونڈی کے ساتھ یہ تعلق رکھنا بالکل بھی ظالمانہ اور معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ یہ ناگزیر تھا اور اگر کوئی اس بات کو ایسا سمجھتی تو اس کے لیے مکاتبت کا دروازہ کھلا تھا لیکن کسی نے بھی

اس وجہ سے مکاتبت کا فائدہ نہیں اٹھایا۔میرا سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ماریہ قطبیہ نے نبی کریم سے آزادی کا مطالبہ کیا تھا؟

یہاں کوئی یہ سوال بھی کرسکتا ہے کہ پیغمبر نے آخر ایک لونڈی کو رکھا ہی کیوں اور اُسے خود سے آزاد کیوں نہ کر دیا۔اس بات میں بڑا وزن ہے لیکن جو شخص یہ جانتا ہو کہ اُن کا آپ کے ملکیت میں آنے کا پس منظر کیا تھا تو یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ماریہ قطبیہ کو آپ کی طرف مصر کے بادشاہ کی جانب سے تحفہ میں بھیجا گیا تھا۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے بادشاہ کی طرف دین اسلام کا پیغام بھیجا تو نہ تو اُس نے اس پیغام کو رد کیا اور نہ ہی قبول کیا بلکہ پیغمبر اور اسلام کے ساتھ اپنے رجحان کے اظہار کے طور پر قیمتی تحفے بھیجے۔بادشاہ نے جواب میں یہ پیغام بھیجا کہ میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر مبعوث ہونے والے ہیں لیکن ان کی بعثت شام کے علاقے میں ہونی تھی اور پھر اس نے اپنے تحفوں کا ذکر کیا جن میں دو باقدر لونڈیاں اور سواری کے لیے ایک خچر شامل تھا جنہیں آپ نے قبول فرمایا اور تاریخ میں یہ اسی طرح بیان کیا جاتا ہے۔

اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے پیغمبر کی طرف تحفہ میں غلام لونڈیوں کا بھیجنا ایک ہمدردانہ اور شاندار عمل سمجھا اور پیغمبر کی طرف رغبت کی علامت کے طور پر ایسا کیا نہ کہ اسے معیوب سمجھتے ہوئے ایسا کیا۔اب یہاں پیغمبر کو بادشاہ کے ان تحائف کے ساتھ کیا کرنا چاہیے تھا جبکہ وہ بادشاہ آپ کے اسلام کے پیغام کا مخاطب بھی تھا اور متوقع تھا کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیتا۔کیا پیغمبر کو اُن دونوں لونڈیوں کو دوسروں میں تقسیم کر دینا چاہیے تھا جو کہ تحائف کو ٹھکرانے ہی کی دوسری شکل ہوتی۔(یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایک دوسرے علاقے کی لڑکی اس دور کے معاشرے میں آزادانہ اکیلے زندگی نہیں گذار سکتی تھی)۔اس لیے پیغمبر نے وہی کیا جوان

کو کرنا چاہیے تھا۔ اُنہوں نے صرف ایک لونڈی کو رکھا جس سے بادشاہ کو بھی اپنے تحائف بھیجنے کے جواب میں اچھا اشارہ ملا اور ساتھ ہی پیغمبر کو لوگوں کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کرنے کا بھی موقع ملا کہ لونڈی غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔

بھائی محسن نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ آپ نے اُس لونڈی سے نکاح کیوں نہیں کیا تو میں نے اُن کو توجہ دلائی کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر پابندی لگا دی تھی کہ آپ اپنی ازواج کے علاوہ اب کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتے تھے، سورۂ احزاب (50:33)۔ اس حکم کی تفصیل ایک علیحدہ موضوع ہے جو کچھ تفصیل کا تقاضا کرتا ہے لیکن ہماری غلامی کی بحث سے اس کا تعلق نہیں ہے اس لیے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائینگے۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بالکل واضح ہے کہ ماریہ قطبیہ کا معاملہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے اور اسے اس بات کے نمونے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبر نے غلامی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو کچھ بھی آپ نے کیا وہ اوپر کی گفتگو سے واضح ہے کہ اسلام کے پیغام کو فروغ دینے کی خاطر تھا اور آپ کا مقصد ایک غلام لونڈی کو اپنی ملکیت میں رکھنا ہرگز نہ تھا۔ اگر آپ ایسا چاہتے تو عرب تو پہلے ہی بے شمار خوبصورت لونڈیوں سے بھرا پڑا تھا جن میں سے آپ جسے چاہتے اپنی ملکیت میں لا سکتے تھے لیکن آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

والسلام

اللہ سے ڈریے

پھر اس شخص سے ڈریے جو اللہ سے نہیں ڈرتا

سوال و جواب

ابو یحییٰ

حضرت علیؓ کا مقام و مرتبہ

سوال: السلام علیکم

میرا سوال ہے کہ اہل تشیعہ حضرات کے حضرت علی اور اہل بیت کے بارے میں مبالغہ آمیز رویے کی بنا پر غیر شیعہ مسلمانوں کے دلوں سے حضرت علی کی محبت کا وہ عالم نہیں جو دیگر صحابہ کرام کے لیے ہے۔ ہمیں اس رجحان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیے، عرفان رشید۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمیں ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔ حضرت علیؓ کا مقام، مرتبہ اور قربانیاں غیر معمولی ہیں۔ ہمیں اسی پس منظر میں سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آل علی کے بارے میں نقطہ نظر قائم کرنا چاہیے۔

دیکھیے جو معاملہ آنجناب کا ہوا ہے کم و بیش وہی معاملہ سیدنا عیسی علیہ السلام کا ہے کہ مسیحی حضرات نے انہیں معاذ اللہ خدا بنا دیا۔ تو کیا ہمارے دل میں اس وجہ سے ان کی قدر منزلت کم ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ یہی معاملہ سیدنا علیؓ کا ہے۔ آپ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ایک تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو پالا اور عملاً آپ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹوں کی طرح تھے۔ پھر آپ کی سب سے چھوٹی اور محبوب صاحب زادی کے شوہر ہونے کی بنا پر داماد ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

قرابت داری کے اس غیر معمولی تعلق سے قطع نظر ذاتی حیثیت میں اسلام کے لیے آپ کی خدمات اور قربانیاں بڑی غیر معمولی ہیں۔ آپ وہ تلوار تھے جس سے اللہ کے دشمن ہمیشہ خوفزدہ

رہے اور آپ کی شجاعت و بہادری ہر جنگ کے موقع پر مسلمانوں کے لیے باعث تقویت رہی۔ کفار کے خلاف ہر جنگ میں آپ کی تلوار اسلام اور مسلمانوں کا بہترین طریقے پر دفاع کرتی رہی۔ آپ کی شجاعت کے ساتھ آپ کا علم اور آپ کی سادگی بھی ضرب المثل ہے۔ آپ علم و حکمت کا خزانہ تھے اور زندگی بھر اس خزانے کو لوگوں میں لٹاتے رہے۔ ذاتی تقویٰ اور سادگی کے پہلو سے بھی آپ کی زندگی بے مثل ہے۔

عہد رسالت کے بعد بھی آپ کا کردار بے مثال رہا۔ خلافت راشدہ میں سیدنا علی تینوں ابتدائی خلفاء کے اہم ترین مشیر رہے۔ ان کی کامیابیوں میں آپ کے گراں قدر مشوروں کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ آپ صاحب الرائے شخص تھے، اس لیے بعض معاملات میں آپ کو اختلاف ہوا، مگر آپ کا یہ اعلیٰ ترین کردار ہے کہ آپ اس کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی کا اہم ترین ستون بنے رہے۔ آپ نے انتہائی مشکل حالات میں اقتدار سنبھالا جب بدترین لوگ آپ کے اردگرد موجود تھے۔ مگر ہر مرحلے پر آپ نے اسلام کے اعلیٰ ترین اصولوں اور بہترین اخلاقی رویے کا مظاہرہ کیا اور خلافت راشدہ کی اعلیٰ ترین روایات کو بہترین طرز پر نبھایا۔ آخر کار ایک باغی گروہ یعنی خوارج کے ہاتھوں شہادت کا منصب حاصل کر کے آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔

احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آپ کے مقام و مرتبے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بیان ہوا ہے وہ خود آپ کی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔ اس کا مطالعہ بھی ضرور کیجیے۔ کسی شخص کی عظمت کے اتنے پہلو دیکھ کر انسان کے دل میں اس کی محبت اور عظمت کا نقش کیسے نہیں بیٹھے گا؟

حضرت حسنؓ کی خلافت اور صحابہ کرام کی باہمی جنگیں

سوال: السلام علیکم

جواب دینے کے لیے شکریہ۔ میں سو فیصد آپ سے متفق ہوں، مگر اس حوالے سے ایک دو سوال اور ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت علی نے اپنے بیٹے حضرت حسن کو خود خلیفہ کیوں نامزد کیا۔ یہ بظاہر شوریٰ کے اسلام تصور کے خلاف ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہ اور حضرت عائشہؓ سے جنگ کیوں کی۔ وہ دونوں تو صرف حضرت عثمانؓ کے قتل میں انصاف اور قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھے تھے۔ حضرت علیؓ نے قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں کیوں کھڑا نہیں کیا، عرفان رشید۔

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے دوسرے سوال کا جواب میں پہلے دے دیتا ہوں کہ سیدنا علی نے سیدنا حسن کو خلیفہ نہیں بنایا تھا بلکہ دوسروں کو ایسا کرنے سے روکا نہیں تھا۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کا انتخاب عام لوگوں نے کیا تھا اور سیدنا حسن کی خلافت کو ان تمام مسلمانوں کی تصویب حاصل تھی جو حضرت علی کے ساتھ تھے۔ دوسرے سوال کا جواب ذرا تفصیلی ہے۔ جس میں پہلے مرحلے پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ صحابہ کرام کون تھے۔

ہماری ناقص رائے میں صحابہ کرام کی سیرت و کردار اور ان کے مقام و مرتبے کو جانچنے کا بنیادی معیار تاریخ نہیں قرآن پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرام کی حیثیت کیا ہے، دین کی خدمت میں ان کا کردار کیا اور ان کی عمومی سیرت و کردار کیا ہے، ان چیزوں کو قرآن کریم نے موضوع بنا کر بیان کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے

ہو،منکر سے روکتے ہواوراللہ پرایمان رکھتے ہو۔"(آل عمران110:3)

"اور جولوگ ایمان لائے،ہجرت کی اوراللہ کی راہ میں جہاد کیا،اوروہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی،یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔"(الانفال8:74)

" اوراللہ کی راہ میں جدوجہد کروجیسا کہ اس کا حق ہے۔اسی نے تم کو برگزیدہ کیااوردین کے معاملے میں تم پرکوئی تنگی نہیں رکھی۔تمھارے باپ-ابراہیم- کی ملت کو(تمھارے لیے پسندفرمایا)۔اسی نےتمھارانام مسلم رکھا،اس سے پہلے۔اوراس (قرآن) میں بھی (تمھارانام مسلم) ہے۔تاکہ رسول تم پراللہ کے دین کی گواہی دے اورتم دوسرے لوگوں پراس کی گواہی دو۔اورنماز کااہتمام رکھواورزکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کومضبوط پکڑو۔وہی تمھارامرجع ہے اورکیاہی خوب مرجع اورکیاہی خوب مددگار ہے"!(الحج22:78)

"محمدﷺ،اللہ کے رسول،اورجوان کے ساتھ ہیں وہ کفار پرسخت،آپس میں رحم دل ہیں۔تم ان کواللہ کےفضل اوراس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع وسجود میں سرگرم پاؤگے۔ان کاامتیازان کے چہروں پرسجدوں کےنشان سے ہے۔ان کی یہ تمثیل تورات میں ہے۔اورانجیل میں ان کی تمثیل یوں ہے کہ جیسےکھیتی ہوجس نے نکالی اپنی سوئی،پھراس کوسہارادیا،پھروہ سخت ہوئی،پھروہ اپنے تنے پرکھڑی ہوگئی کسانوں کے دلوں کوموہتی ہوئی تاکہ کافروں کے دل ان سے جلائے۔اللہ نے ان لوگوں سے جوان میں سے ایمان لائے اورجنھوں نے نیک عمل کیے مغفرت اورایک اجرعظیم کاوعدہ کیاہے۔ "(الفتح48:29)

یہ آیات صحابہ کرام اوران کے کردارکے بارے میں ہرقسم کےشک وشبہاورکنفیوژن کاخاتمہ کردیتی ہیں۔یہ بتاتی ہیں کہ وہ صحابہ اللہ تعالیٰ کےمنتخب کردہ لوگ تھےجن پراللہ کےرسول نے

دین کی شہادت دی تھی اور پھر یہ صحابہ کا منصب تھا کہ وہ دنیا تک اس دین کو پہنچانے والے بنے۔اسی طرح یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ بے مثل سیرت وکردار کے لوگ تھے جو اللہ اور بندوں کے حقوق پوری طرح سمجھتے تھے۔تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام واقعتاً ایسے ہی لوگ تھے۔انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر طرح کے حالات میں بھرپور ساتھ دیا اور آپ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں اس دور کی پوری متمدن دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔

اس کے بعد ہم ان اشکالات کی طرف آتے ہیں جو جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ کی بنا پر آپ کے ذہن میں ہیں۔یہ جنگیں اور سیدنا علی کے دور میں ہونے والے دیگر ناخوشگوار واقعات، اچانک پیش نہیں آئے بلکہ ان کے پیچھے تاریخی واقعات کا ایک تسلسل ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔اس کے لیے آپ کو تاریخ میں کچھ پہلے جانا ہوگا اور اس فساد کی وجوہات پر غور کرنا ہوگا جو حضرت عثمان کے دور میں برپا ہوا۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے دور میں اسلام انتہائی مختصر وقت میں تمام متمدن دنیا میں پھیل گیا۔آپ اندازہ کیجیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف پندرہ بیس برس کے اندر وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ اور بلوچستان سے لے کر شام وعراق تک لاکھوں مربع کلومیٹر کا علاقہ اسلام کے دائرے میں آیا اور وہاں رہنے والے کروڑوں لوگ اسلام کی روشنی میں داخل ہوگئے۔تاہم حضرت عثمان کے دور خلافت تک دو غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ایک یہ کہ ابتدائی اسلام لانے والے مسلمانوں اور اکابرین صحابہ کی ایک بڑی تعداد کا انتقال ہو چکا تھا۔دوسرے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ ابھی غیر تربیت یافتہ تھے۔وہ ایک برتر مذہب کی حقانیت کے قائل تو ہوگئے تھے،مگر اپنی قدیم تہذیبوں، مذاہب

اور رسوم وعادات کا رنگ ان پر سے ابھی نہیں اترا تھا۔

یہ وہ صورتحال تھی جس سے فائدہ اٹھا کر کچھ فتنہ پرور لوگوں نے جو بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے، فساد پھیلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے افواہوں اور غلط فہمیوں کا ایک بازار گرم کر کے دور دراز صوبوں کے بعض لوگوں کو خلیفہ وقت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کر دیا۔ یہ لوگ حج کے بہانے مصر، کوفہ اور بصرہ سے نکلے اور مدینہ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اسے محض اپنے خلاف لوگوں کی ذاتی شکایت سمجھتے رہے، اسی لیے انہوں نے کوئی سخت اقدام نہ کیا۔ وہ ان لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا مخلص مسلمان سمجھتے رہے تاہم یہ لوگ اصلاً فسادی تھے۔ آخر کار ان فسادیوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

یہ وہ اندوہناک واقعہ ہے جس کے بعد معاملات پر کسی کا بھی اختیار نہ رہا۔ دراصل ان فسادیوں نے عام لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے تین جلیل القدر صحابہ کا نام استعمال کیا تھا۔ یعنی حضرات طلحہ، زبیر اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور ان کی طرف بے دریغ ہر قسم کے جھوٹ منسوب کر کے عام لوگوں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کیا۔ یہ ذرائع ابلاغ کا موجودہ دور تو تھا نہیں جب فون اور موبائل پر رابطہ کر کے لوگ ایک دوسرے سے صحیح بات دریافت کر سکتے۔ آخر کار ان لوگوں نے سیدنا عثمان کو شہید کر ڈالا۔ سیدنا عثمان کی شہادت کے بعد ان بلوائیوں نے اعلان کر دیا کہ اہل مدینہ دو دن میں خلفیہ منتخب کر لیں وگرنہ ان تینوں بزرگوں کو شہید کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں سیدنا علی خلیفہ بنے اور دیگر لوگوں کے ساتھ بلوائیوں نے بھی ان کی بیعت کر لی۔

اب حضرت علی خلیفہ ہیں اور بدقسمتی سے بلوائی ان کے ساتھ ہی موجود ہیں۔ ایک دفعہ پھر جھوٹ اور پروپیگنڈا کا طوفان گرم ہے۔ ظاہری صورتحال کو دیکھ کر ہر طرف غلط فہمیاں پھیل رہی

ہیں۔حضرت علی ان کے خلاف تلوار اٹھا نہیں سکتے کہ بلوائی بڑی تعداد میں تھے۔دوسری طرف ان لوگوں کا سیدنا علی کے ساتھ ہونا وہ چیز تھی جس سے دیگر علاقوں میں موجود صحابہ کرام میں غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ایک طرف سے قصاص کا مطالبہ تھا اور دوسری طرف حضرت علی کا مطالبہ تھا کہ پہلے میری بیعت کرو اور مجھے مضبوط کرو تا کہ میں قصاص لے سکوں۔ان حالات میں سیدہ عائشہ، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ کا مشترکہ لشکر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصاص کے لیے نکلا۔مگر جنگ سے قبل ہی حضرت علی نے انھیں اس بات پر قائل کرلیا کہ حضرت علی کی بیعت کرلی جائے اور اس کے بعد قصاص لیا جائے۔یہ صورتحال بلوائیوں کے لیے انتہائی خوفناک تھی۔چنانچہ انھوں نے صبح ہونے سے قبل ہی اندھیرے میں سیدہ عائشہ کے لشکر پر حملہ کردیا۔جس سے دوسری طرف یہ احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ایک دفعہ جنگ چھڑ جائے تو بات سمجھنے سمجھانے کا موقع نہیں رہتا۔یہی اس موقع پر ہوا۔

حضرت امیر معاویہ بھی قصاص عثمان کے علمبردار تھے۔دوسری طرف حضرت علی کا نقطہ نظر اور ان کے حالات وہی تھے جو ہم پیچھے بیان کرچکے ہیں۔نتیجہ یہ نکلا کے غلط فہمیاں بڑھتی گئیں اور نتیجہ جنگ صفین کی شکل میں نکلا۔

قرآن پاک اور تاریخ کی اس روشنی میں آپ کا یہ تجزیہ درست نہیں کہ صحابہ کرام کی ان جنگوں میں سے کسی ایک فریق کا غلط ہونا ضروری ہے۔اصل مسئلہ بلوائیوں کا تھا جنھوں نے ہر قسم میں جھوٹ، منافقت، فریب اور دغا سے کام لے کر یہ فساد پھیلایا۔

منفی سوچ وہ زہر ہے جس کا ایک قطرہ بھی
دماغ کی ہر مثبت سوچ کو آلودہ کردیتا ہے

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 7۔ قانون اوسط سے مدد لیجیے

کیس اسٹڈی:

چند دوست آپس میں اپنے اپنے خدشات اور خوف کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک دوست نے کہا۔ مجھے آسمانی بجلی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب بجلی کڑکتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مجھ پر ہی گرے گی"۔

ایک اور دوست بولا:

"یار مجھے تو فائرنگ سے بہت خوف آتا ہے۔ کراچی شہر کا کچھ پتا نہیں کب نامعلوم سمت سے آنے والی گولی ہمیں چاٹ جائے۔ میں اس خوف کی بنا پر باہر بہت کم نکلتا ہوں اور اکثر پریشان رہتا ہوں۔ اس خوف کے سبب میں اپنی نیند بھی پوری نہیں کر پا رہا۔"

تیسرا دوست جو بڑی دیر سے اپنی بات کو ضبط کیا ہوا تھا بول پڑا۔ "بھئی مجھے تو گھر سے دفتر نکلنے کے بعد دن بھر یہی خیال ستاتا رہتا ہے کہ کہیں میرا چھوٹا بیٹا سیڑھیوں سے تو نہیں گر گیا؟ کہیں میں استری جلتی ہوئی تو چھوڑ کر نہیں آ گیا؟ کہیں میری بیوی کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟۔ انہی خدشات کے پیش نظر میں بار بار گھر فون کرتا اور خیریت معلوم کرتا رہتا ہوں لیکن کچھ دیر بعد پھر کوئی وسوسہ دل میں آ کر سکون غارت کر جاتا ہے"۔

آخری دوست بھی نچلا نہ بیٹھا اور اپنے خوف کو بیان کرنے لگا۔ "بھائیو! میرا مسئلہ کچھ مختلف ہے لیکن نوعیت کے اعتبار سے وہی ہے۔ مجھے مختلف قسم کے امراض کا خوف رہتا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ ڈینگی ہو گیا ہے اور میں راتوں میں اٹھ کر اپنے بدن پر سرخ دھبے تلاش کرتا ہوں،

کبھی مجھے وضو کرتے وقت نیگلیر یا کا خوف ہوتا ہے، کبھی میں کانگو وائرس کی علامات اپنے اندر تلاش کرتا ہوں تو کبھی ہارٹ اٹیک کا وسوسہ میرے شب و روز کو کا سکون غارت کیئے دیتا ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس چکر لگا لگا کر تنگ آ گیا ہوں اور ڈاکٹر بھی مجھ سے نالاں ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آ تا کہ کیا کروں"۔

قریب ہی ایک بزرگ ان دوستوں کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس اس کا علاج ہے۔ سب دوستوں نے اچانک پلٹ کر انہیں دیکھا اور علاج دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا علاج ہے کہ قانون اوسط سے مدد لو۔

وضاحت

ہمارے خارجی اور داخلی ماحول میں بے شمار خدشات اور خطرات موجود ہوتے ہیں۔ ان خطرات میں زلزلے، سیلاب، طوفان ، روڈ ایکسیڈنٹ، فائرنگ ، ہارٹ اٹیک، ڈینگی ، کینسر، معذوری اور اس نوعیت کے دیگر معاملات شامل ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان خطرات کو ایک حد تک ہی قابو کر سکتے اور ان سے ایک حد تک ہی بچ سکتے ہیں۔ باقی زندگی ہمیں انہی کے ساتھ رہ کر گذارنی ہے۔ اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ہر وقت ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنی زندگی اجیرن بنالیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قانون اوسط اور قانون امکانات سے کام لیں۔

قانون اوسط یہ بیان کرتا ہے کہ ہمارے کسی مصیبت یا حادثے کے شکار ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آسمانی بجلی ساڑھے تین لاکھ میں سے کسی ایک فرد پر ہی گرتی ہے، کینسر میں ہر آٹھ میں سے ایک شخص ہی ہلاک ہوتا ہے۔ فائرنگ سے کروڑوں کے شہر میں دس یا بارہ افراہی ہلاک ہوتے ہیں۔ ڈینگی مچھر اتنی بڑی آبادی میں محض چند درجن

لوگوں ہی کو متاثر کر پاتا ہے وغیرہ۔ جب آپ اس قانون سے کام لیں گے تو آپ کو علم ہوگا کہ آپ پر کسی بیماری، جرثومہ یا آفت کے حملے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ آپ پرسکون رہیں، حفاظتی تدابیر اختیار کریں، اللہ سے دعا کریں، اللہ پر توکل کریں، اور نتائج سے بے پروا ہوکر اپنا کام خاموشی سے کرتے رہیں۔

اس پر ایک اعتراض یہ وارد ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے آج گولی مجھے ہی لگ جائے یا ڈینگی سے متاثر ہونے کی باری میری ہی ہو یا آج حادثہ میرے ہی ساتھ ہوجائے۔ اب کیا کیا جائے؟ اس مشکل کے تین حل ہیں۔ پہلا حل تو یہ کہ ہم تمام گولی مارنے والے لوگوں کو ختم کردیں یا تمام ڈینگی ہلاک کردیں یا تمام حادثات رونما ہونے کے امکانات ختم کردیں اور جب تک ایسا نہ کرلیں چین سے نہ بیٹھیں۔ اگر آپ اس آپشن پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجئے لیکن ایک نارمل آدمی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ دوسرا حل یہ ہے کہ ہم ہجرت کرکے کسی ایسی جگہ چلیں جائیں جہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا کرنے سے آپ کا مسئلہ حل ہوسکتا ہو تو ضرور ایسا کریں۔ لازمی سی بات ہے کہ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا ہو۔ ہاں اس کے امکانات کم ہوسکتے ہیں اور جونہی آپ امکانات کی بات کرتے ہیں تو آپ دوبارہ قانون اوسط پر آجاتے ہیں۔ نیز ہجرت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ جب تک آپ کسی پرسکون جگہ تک نہیں پہنچ جاتے آپ کو ان مشکلات کو برداشت کرنا اور ان کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ تیسرا حل ان مشکلات کیساتھ زندہ رہنا اور وہی قانون اوسط سے مدد لینا ہے۔ اور یہی اس کا حل ہے۔

اسائنمنٹ

۔ان خدشات اور خوف کی نشاندہی کریں جو آپ کو تنگ کرتے ہیں۔

۔خوف کا جائزہ لیں کہ وہ حقیقی ہیں یا غیر حقیقی۔اگر غیر حقیقی اور وہم ہیں تو اسے یکسر نظر انداز کر دیں۔

۔ان کے بارے میں ڈیٹا اکھٹا کریں کہ اس کے کتنے امکانات ہیں کہ وہ حادثہ آپ کے ساتھ وقوع پذیر ہو سکے۔

۔اس حادثے سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر نوٹ کریں اور انہیں اختیار کریں۔

۔اللہ سے دعا کریں اور پھر اس پر کامل بھروسہ کر لیں کہ وہ آپ کو اس مشکل سے بچائے گا۔

۔ان اقدام کے بعد کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں اور اپنا کام کرتے رہیں۔

ایمان کا اثر معاملات زندگی

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا قال لاایمان لمن لا امانۃ لہ و لادین لمن عھد لہ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی خطبہ دیا، اس میں یہ ضرور فرمایا کہ جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان نہیں اور جسے عہد کا پاس نہیں، اس کے پاس دین نہیں ہے۔

ایمان کا اثر اخلاق پر

عن عمرو بن عبسۃ قال قلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماالایمان قال الصبر والسماحۃ۔ (مسلم)

حضرت عمرو بن عبسہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایمان نام ہے صبر اور سماحت کا۔

ابو یحییٰ

مضامین قران (4)

قرآن مجید کے مضامین کا اجمالی خاکے کی تفصیلات کو بیان کرنے کے بعد اب ہم ایک ایک مضمون کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ اجمالی خاکہ بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے وہ ربط نمایاں ہو کر سامنے آجائے جو قرآن مجید میں بیان کردہ موضوعات میں پایا جاتا ہے۔ اس اجمالی خاکے میں ہم نے دیکھا تھا کہ قرآن مجید کے بنیادی موضوعات صرف تین ہی ہیں۔ یعنی

۱) دعوت دین اور اس کے ردو قبول کے نتائج

۲) دعوت کے دلائل

۳) مطالبات

ان کے ذیل میں آنے والے بنیادی مضامین کی تعداد تقریباً تین درجن ہے۔ قرآن مجید کم و بیش انہی موضوعات پر کلام کرتا ہے۔ ایک طالب علم اگر ان موضوعات کو سمجھ لے تو قرآن کریم کا مدعا سمجھنے میں نہ صرف بڑی سہولت رہتی ہے بلکہ فکر و تدبر اور ہدایت و نصیحت کے پہلو سے بھی انسان کے لیے قرآن مجید سے نفع اٹھانا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ ان ذیلی موضوعات کی تفصیل کرتے وقت ہمارا طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ہر مضمون میں بیان کی گئی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید کے بیانات کی روشنی میں یہ بیان کیا جائے گا کہ وہ کیا پیغام ہے جو انسانیت کو دیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوشش کی جائے گی کہ بنیادی موضوعات سے ربط کو واضح رکھا جائے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم اس کام کا آغاز دلائل قرآن سے کرتے ہیں۔

وجود باری تعالیٰ کے دلائل

قرآن کریم کی بنیادی دعوت عبادت رب کی دعوت ہے۔اس حوالے سے اہم مسئلہ جو قرآن مجید میں زیر بحث آیا وہ توحید باری تعالیٰ اور ایک اللہ کی عبادت تھی۔انسان کی پوری تاریخ میں اصل اور بنیادی مسئلہ شرک رہا ہے۔وجود باری تعالیٰ کو منوانے کی ضرورت اس لیے پیش نہیں آئی کہ ہر دور کے انسان، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتے رہے ہیں۔تاہم انیسویں صدی میں ایک وقت آیا تھا جب بعض نامکمل سائنسی دریافتوں کی بنا پر انسانیت کو یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی تھی کہ مادہ آخری حقیقت ہے اور جو چیز حواس انسانی کی گرفت میں نہ آسکتی ہو، بلاواسطہ قابل مشاہدہ نہ ہو یا تجرباتی طور پر قابل تصدیق نہ ہو وہ موجود ہی نہیں ہوسکتی۔تاہم بیسویں صدی خود سائنسی دریافتوں ہی نے اس غلط فہمی کو رفع کردیا۔گرچہ آج بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو خدا کے وجود کی قائل نہیں، مگر اس کی وجہ کوئی علمی یا عقلی دلیل نہیں بلکہ خارجی طور پر اہل مذہب کے بعض رویوں کے خلاف ردعمل یا پھر داخلی طور پر بعض نفسیاتی مسائل ہیں جو انسانی زندگی کی محرومیوں، اس کی محدودیت اور ناتمامی کو دیکھ کر جنم لیتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے براہ راست وجود باری تعالیٰ کے ثبوت پر تفصیلی کلام نہیں۔ گرچہ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ توحید، رسالت اور آخرت کے حوالے سے دی جانے والی ہر دلیل درحقیقت بالواسطہ طور پر وجود باری تعالیٰ ہی کی دلیل ہے۔یعنی اگر ثابت ہوجائے کہ معبود ایک ہے، وہ نبی اور رسول بھیجتا ہے اور اور ایک روز وہ یوم آخرت قائم کرے گا تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق بھی ہے۔کیونکہ یہی خالق؛ معبود برحق، رسولوں کا بھیجنے والا اور ایک روز انسانیت کا حساب کتاب کرنے والا بھی ہے۔تاہم اس حقیقت کے باوجود قرآن مجید نے دو اعتبارات سے اجمالی طور پر وجود باری تعالیٰ کا بالواسطہ اثبات کیا ہے۔

ایک انسان کی روحانی اساس کے پہلو سے اور دوسری کائنات کی عقلیہ توجیہ کے لحاظ سے۔

ا)انسان کا روحانی پہلو اور تاریخی تسلسل

انسان کے نفسیاتی وجود کی ساخت میں یہ چیز اساسی طور پر شامل ہے کہ وہ مادی، جبلی اور حیوانی تقاضوں سے بلند تر ہو کر ان لطیف احساسات کو اپنے اندر محسوس کرے جن کی کوئی توجیہ اس کی حیوانی جبلت اور عقلی استعداد کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔ان میں سب سے اہم اور بنیادی جذبہ کسی برتر ہستی کے سامنے جھکنے،اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے، ہر کرم و احسان کو اس کی عطا ماننے اور اس کا شکریہ ادا کرنے، اس کے غضب سے بچنے اور ہر مشکل میں اسے پکارنے کا ہے۔قرآن مجید کے مطابق یہ احساسات تخلیق کے وقت نفخ روح اور تسویہ کے عمل کے دوران انسانی فطرت میں ودیعت کیے گئے اور اس دنیا میں آنے سے قبل ایک باقاعدہ عہد و پیمان کی شکل میں خالق کائنات نے باقاعدہ اپنا تعارف کرا کے انسانوں کو اس دنیا میں بھیجا۔اس مخصوص واقعہ کا نقش گرچہ امتحان کی غرض سے ذہن انسانی سے محو کر دیا گیا،مگر اس کی فطرت پر روحانیت کی یہ تحریر اتنی واضح ہے کہ فلسفہ،تشکیک اور الحاد کی گرد اس تحریر کو کتنا ہی دھندلا دے، انسان اسے ہمیشہ اپنے اندر کی صدا ہی سمجھتے رہے ہیں۔

پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ شکل میں انسان کی تخلیق کرتے وقت ابتدائی دو انسانوں یعنی آدم و حوا کو باقاعدہ ان کے رب سے متعارف کروا کر اس دنیا میں بھیجا گیا۔حضرت آدم کو مخاطبت کا شرف عطا کر کے منصب نبوت پر فائز کیا گیا۔چنانچہ انہوں نے یہ تصور رب باقاعدہ اپنی اولاد کو منتقل کیا۔اور ان کی اولاد بھی اپنے مشاہدات کی بنیاد پر ابتدا ہی سے اپنے خالق سے واقف رہی ہے۔یوں داخل ہی کی نہیں بلکہ خارج کی شہادت بھی روز ازل سے انسان کو اس کے رب کا تصور دیتی رہی ہے اور شیطان کی تمام تر در اندازی کے باوجود لوگ اس رب کے ساتھ شریک بنانے پر

تو آمادہ ہو گئے، لیکن اس کے وجود کے انکار کی روایت انسانیت میں کم ہی جڑ پکڑ سکی ہے۔

قرآن مجید کے بیانات

جیسا کہ ہم نے عرض کیا وجود باری تعالیٰ کا اثبات چونکہ قرآن مجید کا براہ راست موضوع نہیں ہے۔ اس لیے استدلال بھی بالواسطہ ہی ہے۔ اس بنا پر اس میں ایک نوعیت کا ایجاز و اجمال پایا جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی قرآن مجید کے بیانات کو انسانی فطرت کے آئینے اور انسانی دنیا کے حقائق کے سامنے رکھ کر دیکھا جاتا ہے، بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہی معاملہ انسان کی روحانی اساس کا بھی ہے۔

قرآن مجید نے انسانی تخلیق کے مدارج کو کئی مقامات پر موضوع بحث بنایا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ جب اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''، (ص72-71:38)

اس بات کی مزید تفصیل اس طرح کی گئی ہے۔

''اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ جب اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''، (الحجر29:15)

ان دونوں آیات میں انسان کے مادی وجود کے حیوانی قالب میں تسویے (درست کرنے) کے بعد نفخ روح یعنی روح پھونکنے کے عمل کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امور متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت ہم مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ مگر جب یہی بات سورہ شمس میں بیان کی گئی تو وہاں تسویے کے بعد نفخ روح کی جگہ الہام کا لفظ لا کر یہ واضح کر دیا گیا کہ انسان کا حیوانی

وجود مختلف مراحل سے گزر کر جب درجہ کمال کو پہنچ گیا تو پھر انسان پر ایک خاص نوعیت کا الہام کیا گیا جس سے انسان کو نیکی و بدی کا وہ شعور ملا جس کی اساس سرتاسر اخلاقی تھی۔سورہ سجدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی الہام کے نتیجے میں انسان کو اپنی ذات کا شعور اور عقل وفہم کی وہ صلاحیت بھی عطا ہوئی جو اسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ان دونوں آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''اورانسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔پھراس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے چلائی۔پھر اُس کو درست کیا۔پھراس میں اپنی روح پھونکی اورتمہارے کان اورآنکھیں اوردل بنائے مگرتم بہت کم شکر کرتے ہو۔''،(السجدہ9:32)

اس آیت میں نفخ روح سے قبل انسان کا ذکر غائب کے صیغے میں ہورہا تھا،مگراس کے بعد فوراًانسان کومخاطب کر کے عقل وفہم کی صلاحیتوں کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نفخ روح کے بعد ہی انسان کو اپنی ہستی کا ادراک ہوا اوراسی کے نتیجے میں انسان کوکان،آنکھ اوردل یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا ہوئی۔

انسان میں اپنی ذات کے شعوراور عقل وفہم کی صلاحیت کے ساتھ خیر وشر کا شعور بھی اسی نفخ روح کا نتیجہ ہے۔جیسا کہ سورہ شمس اللہ تعالیٰ نے تسویے کے ذکر کے بعد میں نفخ روح کی جگہ الہام کے عمل کو بیان کر کے اس کی وضاحت کردی ہے۔

''قسم ہے نفس انسانی کی اورجیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔پھراس کی بدی اورتقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کردیا۔''، (الشّمس91:7-10)

یہی وہ اخلاقی شعور ہے جو مثال کے طور پر انسان کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بوڑھے

والدین کی ذمہ داری اس وقت اٹھائے جب ایسا کرنے میں اسے کوئی مادی نفع حاصل ہوتا ہو نہ کسی جبلت کی تسکین ہوتی ہو۔ ''نفخ روح'' کا عمل انسان میں احساس ذات، عقل وفہم کی صلاحیت اور اخلاقی شعور کے علاوہ ایک روحانی حس بھی پیدا کرتا ہے جس کی تسکین بندگی کے سوا ممکن نہیں۔ قرآن کریم نے ان تینوں مقامات (سورہ سجدہ، ص، حجر) پر انسان کی اس روحانی اساس کو ''اپنی روح'' کے الفاظ لا کر واضح کیا ہے۔ روح کی حقیقت جو بھی ہو مگر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کے مادی قالب میں جو روح پھونکی گئی، وہ جس کی طرف سے آئی ہے اس کی طرف ایسے ہی لپکتی ہے جیسے بچی ماں کی طرف۔ یہ انسان میں ایک ایسا روحانی طلب پیدا کرتی ہے جس کی تسکین کسی مادی ذریعے سے ممکن نہیں۔ اسی کی بنا پر انسان کا مادی وجود اور حیوانی قالب؛ مادیت سے بلند ایک روحانی ہستی کے شعور سے کبھی خالی نہیں رہتا۔

قرآن کریم یہی واضح نہیں کرتا کہ روحانیت انسان کی اجزائے ترکیبی کا ایک لازمی حصہ ہے وہ انسان کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ یہ اس کے لاشعور کا بھی حصہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید اس طرح بیان کرتا ہے۔

''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس سے بے خبر ہی تھے یا اپنا عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر آپ کیا اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو) اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔'' (الاعراف 7:172-174)

یہ بات بالبداہت واضح ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کو بھیجتے وقت اس خاص واقعہ کا شعور انسانی یادداشت سے اسی طرح مٹا دیا گیا ہے جس طرح مثال کے طور پر شیر خوارگی کے عمر کے بیشتر یا تمام واقعات انسان کو یاد نہیں رہتے۔ مگر اس کے شعور کی تشکیل میں یہ واقعات بڑا کردار ادر کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ماضی کا یہ عظیم واقعہ انانیت کے لاشعور کا لازمی حصہ ہے جسے گرچہ انسان بھولا ہوا ہے، مگر اس کی روحانی شخصیت کی صورت گری میں اس واقعہ کا بھی بہت اہم حصہ ہے۔ نفخ روح کے ساتھ یہ واقعہ بھی خالق کی ذات کا شعور اس کے اندر اس طرح پیوست کر دیتا ہے جب تک انسان ارادی طور پر یہ طے نہ کر لے کہ اسے ساری زندگی خدا کا نام لینا ہی نہیں، اس کی فطرت خدا کی طرف لپکتی رہتی ہے۔

انسان کے اجزائے ترکیبی اور لاشعور کی تشکیل کے ساتھ وجود باری تعالیٰ کو انسانی تاریخ کے آغاز میں میں ایک محسوس اور معلوم واقعے کے طور پر متعارف کرانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ بات کئی مقامات پر واقعہ آدم و ابلیس کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ اس دنیا میں مادی قالب میں بھیجتے وقت انسان کو اس کی فطرت اور لاشعور ہی پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ انسانوں کے جدامجد حضرت آدم اور حضرت حوا کو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مکمل شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا۔

''اور وہ واقعہ بھی اِنھیں سناؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، لیکن ابلیس نہیں مانا۔ اُس نے انکار کیا اور اکڑ بیٹھا اور اِس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالم قرار پاؤ گے۔ پھر شیطان نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس حالت میں وہ تھے، اُس سے اُنھیں نکلوا کر

چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: (یہاں سے) اتر جاؤ، اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس کی توبہ اُس نے قبول کر لی۔ بے شک، وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔'' ، (البقرہ 2:34-37)

یہی شعور بعد میں اولادِ آدم میں جاری رہا۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم کے ابتدائی لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود اور نیکی بدی کے اس تصور سے پوری طرح آگاہ تھے جو فطرت میں الہام کیا گیا اور جس کی تعلیم حضرت آدم نے دی تھی۔

''اور اِنھیں آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت بھی ٹھیک ٹھیک سنا دو، جب اُن دونوں نے قربانی پیش کی تو اُن میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔ اُس نے کہا: میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اُس نے جواب دیا: اللہ تو صرف اپنے پرہیزگار بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تمھارے قتل کے لیے ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہوں۔ میں اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تم ہی سمیٹ لو اور دوزخی بن کر رہو اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔ بالآخر اُس کے نفس نے اُسے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور وہ (اُسے مار کر) نامرادوں میں شامل ہو گیا۔''، (المائدہ 5:27-30)

قرآن کریم بالکل واضح ہے کہ ایک زمانے تک لوگ ان تصورات میں ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے تھے اور اختلاف بعد میں پیدا ہوا جسے رفع کرنے انبیا آتے رہے (البقرہ 2:213)۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ انسان کی روحانی اساس، شخصیت انسانی کی تشکیل کرنے والا لاشعور، اس کی فطرت کا الہام، اس کے ابتدائی اجداد کے براہ راست مشاہدات سے قائم ہونے والی انسانی تاریخ کی روایت؛ سب مل کر وجود باری تعالیٰ کی اس

طرح شہادت دیتی ہیں کہ انسان کبھی اس تصور سے ہٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ انسان اس دنیا میں ایک حیوانی قالب میں بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی و نسل کو برقرار رکھنے کے لیے یہ خصوصی اہتمام کیا گیا ہے کہ مادی اور اور جبلی تقاضے ہمیشہ بہت شدید ہوتے اور فوری اپنا تقاضا چاہتے ہیں۔ مثلاً بھوک و پیاس فوری اپنی تسکین کا تقاضہ کرتی ہے۔ جنس کی جبلت صنف مخالف کے قرب کا شدید تقاضہ کرتی ہے، خوف کی جبلت اپنے تحفظ کے لیے انسان کو فوراً متحرک کر دیتی ہے۔ یہ سب نہ ہوں تو انسان کا مادی وجود بقا کی جدو جہد میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس لیے انسان پر بالعموم مادی تقاضوں کا غلبہ رہتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ میں پائی جانے والی مذہب کی مستقل روایت، مراسم عبودیت اور پرستش کی کثرت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر فطرت انسانی ایک برتر ہستی کے سامنے جھک جانے کے تصور کی تصوب و تائید اپنے اندر سے نہ پاتی تو کبھی اس طرح ان چیزوں کو قبول عام حاصل نہ ہوتا۔ مادیت کا سیلاب، مفادات کی دوڑ، خواہش کی یلغار بندگی کی اس عظیم انسانی رویت کو کب کا خس و خاشاک میں ملا چکی ہوتی۔ مگر سب سے بڑھ کر حیرت انگیز بات انسانی تاریخ کا یہ سبق ہے کہ خواہش تو دور کی بات ہے مذہب اور نظریے کے نام پر بھی اگر تصور خدا کو مٹانے کی کوشش کی گئی تو اس کے بالکل الٹے نتائج نکلے ہیں۔ مثلاً جب بدھ مت نے مذہب کے نام پر خدا کی روایت کو ختم کرنا چاہے تو گوتم بدھ کے پیرو کاروں نے اسی کو معبود بنا ڈالا اور جب کمیونزم نے نظریہ کی بنیاد پر خدا کے تصور کو ماضی کا قصہ قرار دیا تو انسانیت نے خود کمیونزم ہی کو ماضی کے قبرستان میں دفن کر ڈالا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا ثبوت کیا ہوگا کہ خدا کا تصور خارج کی ٹھونسی ہوئی چیز نہیں بلکہ انسان کی فطرت کی آواز ہے جو وقتی طور پر دبائی جا سکتی ہے، ختم نہیں کی جا سکتی۔

[جاری ہے]

قاری حنیف ڈار

شہزادی اور دھوبی کا بیٹا

مرزا مظہر جانِ جاناں ایک مشہور صوفی تھے۔ مرزا مظہر اکثر ایک جملہ کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے تو دھوبی کا بیٹا ھی خوش نصیب نکلا، ہم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا''۔ پھر غش کھا جاتے۔ ایک دن ان کے مریدوں نے پوچھ لیا کہ حضرت یہ دھوبی کے بیٹے والا کیا ماجرا ہے؟

آپ نے فرمایا ایک دھوبی کے پاس محل سے کپڑے دھلنے آیا کرتے تھے اور وہ میاں بیوی کپڑے دھو کر پریس کر کے واپس محل پہنچا دیا کرتے تھے، ان کا ایک بیٹا بھی تھا جو جوان ہوا تو کپڑے دھونے میں والدین کا ھاتھ بٹانے لگا، کپڑوں میں شہزادی کے کپڑے بھی تھے، جن کو دھوتے دھوتے وہ شہزادی کے نادیدہ عشق میں مبتلا ہو گیا،، محبت کے اس جذبے کے جاگ جانے کے بعد اس کے اطوار تبدیل ہو گئے ،وہ شہزادی کے کپڑے الگ کرتا انہیں خوب اچھی طرح دھوتا، انہیں استری کرنے کے بعد ایک خاص نرالے انداز میں تہہ کر کے رکھتا، سلسلہ چلتا رہا آخر والدہ نے اس تبدیلی کو نوٹ کیا اور دھوبی کے کان میں کھسر پھسر کی کہ یہ تو لگتا ہے سارے خاندان کو مروائے گا، یہ تو شہزادی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے،، والد نے بیٹے کے کپڑے دھونے پر پابندی لگا دی،، ادھر جب تک لڑکا محبت کے زیر اثر محبوب کی کوئی خدمت بجالاتا تھا، محبت کا بخار نکلتا رہتا تھا، مگر جب وہ اس خدمت سے ہٹایا گیا تو لڑکا بیمار پڑ گیا اور چند دن کے بعد فوت ہو گیا،

ادھر کپڑوں کی دھلائی اور تہہ بندی کا انداز بدلا تو شہزادی نے دھوبن کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ میرے کپڑے کون دھوتا ہے؟ دھوبن نے جواب دیا کہ شہزادی عالیہ میں دھوتی ہوں، شہزادی نے کہا پہلے کون دھوتا تھا؟ دھوبن نے کہا کہ میں دھوتی تھی،، شہزادی نے اسے کہا کہ یہ کپڑا تہہ کرو،، اب دھوبن سے ویسے تہہ نہیں ہوتا تھا، شہزادی نے اسے ڈانٹا کہ تم جھوٹ بولتی ہو، سچ سچ بتاؤ ورنہ سزا ملے گی، دھوبن کے سامنے کوئی رستہ بھی نہیں تھا دوسرا کچھ دل بھی غم سے بھرا ہوا تھا، وہ زاروقطار رونے لگ گئی،، اور سارا ماجرا شہزادی سے کہہ سنایا، شہزادی یہ سب

کچھ سن کر سناٹے میں آ گئی۔

پھراس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا اور شاہی بگھی میں سوار ہو کر پھولوں کا ٹوکرا بھر کر لائی اور مقتول محبت کی قبر پر سارے پھول چڑھا دیے، زندگی بھراس کا یہ معمول رہا کہ وہ اس دھوبی بچے کی برسی پراس کی قبر پر پھول چڑھانے ضرور آتی،

یہ بات سنانے کے بعد مرزا مظہر کہتے، اگر ایک انسان سے بن دیکھے محبت ہوسکتی ہے تو بھلا اللہ سے بن دیکھے محبت کیوں نہیں ہوسکتی؟ ایک انسان سے محبت اگر انسان کے مزاج میں تبدیلی لا سکتی ہے اور وہ اپنی پوری صلاحیت اور محبت اس کے کپڑے دھونے میں بروئے کار لا سکتا ہے تو کیا ہم لوگ اللہ سے اپنی محبت کو اس کی نماز پڑھنے میں اسی طرح دل وجان سے نہیں استعمال کر سکتے،؟ مگر ہم بوجھ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔اگر شہزادی محبت سے تہہ شدہ کپڑوں کے انداز کو پہچان سکتی ہے تو کیا رب کریم بھی محبت سے پڑھی گئی نماز اور پیچھا چھڑانے والی نماز کو سمجھنے سے عاجز ہے؟

پھر فرماتے وہ دھوبی بچہ اس وجہ سے کامیاب ہے کہ اس کی محبت کو قبول کرلیا گیا جب کہ ہمارے انجام کا کوئی پتہ نہیں قبول ہوگی یا منہ پر ماردی جائے گی، اللہ جس طرح ایمان اور نماز روزے کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح محبت کا تقاضا بھی کرتا ہے، یہ کوئی مستحب نہیں فرض ہے! مگر ہم غافل ہیں۔

پھر فرماتے اللہ کی قسم اگر یہ نمازیں نہ ہوتیں تو اللہ سے محبت کرنے والوں کے دل اسی طرح پھٹ جاتے جس طرح دھوبی بچے کا دل پھٹ گیا تھا،، یہ ساری ساری رات کی نماز ایسے ہی نہیں پڑھی جاتی کوئی جذبہ کھڑا رکھتا ہے، فرماتے یہ نسخہ اللہ پاک نے اپنے نبی کے دل کی حالت دیکھ کر بتایا تھا کہ آپ نماز پڑھا کیجئے اور رات بھر ہماری باتیں دہراتے رہا کیجئے آرام ملتا رہے گا، اسی وجہ سے نماز کے وقت آپ فرماتے تھے" ارحنا بها يا بلال اے بلال ہمارے سینے میں ٹھنڈ ڈال دے اذان دے کر"۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (7)

سوائن فلو

ان دنوں سوائن فلو پھیلا ہوا تھا۔ اس کے خطرے کے پیش نظر ترکی کی حکومت نے جہاز میں فارم تقسیم کروائے تھے جن میں مسافروں نے اپنی تفصیلات کے علاوہ سوائن فلو کی علامات سے متعلق کچھ سوالات کے جواب دینا تھے۔ اس قسم کے فارمز کا حقیقتاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کی وجہ سے ان پڑھ لوگ مشکل میں آ جاتے ہیں۔ میں نے جدہ ایئر پورٹ پر بہت سے سیدھے سادھے دیہاتیوں کو فارم بھرنے کی مصیبت کرتے دیکھا ہے۔ مسافروں کی زندگی مشکل بنانے کی بجائے آسان طریقہ یہ ہے کہ امیگریشن آفیسر کے ساتھ ایک ڈاکٹر کو بٹھا دیا جائے جو امیگریشن کے دوران چند سوالات کر کے ابتدائی معائنہ کرلیا اور اگر کسی میں یہ علامتیں پائی جائیں تو اس کے تفصیلی ٹسٹ وغیرہ کر لیے جائیں۔

میرے ذہن میں ابن بطوطہ کے زمانے کی وبا کی یاد تازہ ہوگئی۔ ان کے شام کے سفر کے دوران وہاں طاعون پھوٹ پڑا تھا جس میں صرف دمشق شہر میں ایک ایک دن میں دو دو ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"میں عظیم طاعون کے زمانے میں ربیع الآخر سن 749ھ (1348ء) کے آخری دنوں میں دمشق پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ حیران کر دینے کی حد تک اس مسجد کی تعظیم کر رہے ہیں۔ بادشاہ کے نائب ارغون شاہ نے اپنے منادی کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دے کہ دمشق کے سب لوگ تین دن روزہ رکھیں اور بازاروں میں کھانا نہ پکائیں۔ لوگوں نے لگاتار تین دن روزہ رکھا۔ آخری روزہ جمعرات کے دن تھا۔ اس کے بعد تمام امراء، شرفاء، جج، فقہاء، اور مختلف طبقات

کے لوگ جامع مسجد میں جمع ہوئے اور ان سے مسجد بھر گئی۔

انہوں نے یہاں جمعہ کی رات نماز، ذکر اور دعا میں گزاری۔ اس کے بعد انہوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ سب کے سب پیدل باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں قرآن مجید تھا اور ان کے امراء تک ننگے پاؤں تھے۔ شہر کے تمام لوگ، مرد و خواتین، چھوٹے بڑے، سب کے سب نکلے۔ یہودی اپنی تورات کے ساتھ نکلے۔ عیسائی اپنی انجیل کے ساتھ نکلے۔ ان کی خواتین اور بچے بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ سب کے سب اللہ تعالی کے حضور عجز و انکسار کے ساتھ اپنے کتاب اور انبیاء کا واسطہ دے کر دعا کر رہے تھے۔ وہ پیدل (باہر کی) مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر وہ زوال کے وقت تک عاجزی سے رو رو کر دعا کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ شہر کی جانب پلٹے اور نماز جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے یہ معاملہ جب ہلکا کیا تو اس وقت ان کے مرنے والوں کی تعداد روزانہ 2000 تک پہنچ گئی۔"

دولت اور عیش میں پڑ کر انسان خود کو اتنا بڑا سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنے خالق کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے۔ وبائی امراض انسان کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ انسان ایک برتر ہستی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا جینا اور مرنا ایک ہی ہستی کے دست قدرت میں ہے۔ ابن بطوطہ کے دور میں طاعون اور ہمارے دور میں ایڈز، برڈ فلو اور سوائن فلو انسان کو اپنے عجز کا احساس دلاتے ہیں۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ اس طرف توجہ دے کر کامیاب ہو یا اس وارننگ کو نظر انداز کر کے ناکام۔

جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دور افق پر بادل کچھ اس طرح چمک رہے تھے جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف چمکتی ہے۔ بادلوں سے کچھ نیچے انطالیہ کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ اب بحیرہ روم ختم ہو رہا تھا اور ہم جزیرہ نما اناطولیہ میں داخل ہو رہے تھے۔ بہتر ہو گا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم ترکی کے جغرافیہ اور تاریخ سے متعلق ضروری واقفیت حاصل کر لیں تا کہ بعد میں ان کا حوالہ دینے میں آسانی ہو۔

ترکی کا تعارف

ترکی ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ جیسا کہ آپ نقشے میں دیکھ سکتے ہیں کہ جدید ترکی کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ بڑا سبز حصہ ایک جزیرہ نما کی شکل کا ہے جو کہ "اناطولیہ" کہلاتا ہے۔ اسے ایشیائے کوچک (MinorAsia) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس چھوٹا حصہ جو سرخ لکیروں میں دکھایا گیا ہے، "تھریس" کہلاتا ہے۔ اناطولیہ ایشیا جبکہ تھریس یورپ کا حصہ ہے۔ تھریس میں ترکی کی سرحد بلغاریہ اور یونان سے ملتی ہے۔

ترکی کا نقشہ اور اس کے مختلف ریجن

اناطولیہ کو مختلف ریجنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نیچے سے دیکھیے تو بحیرہ روم کے ساتھ والا حصہ "میڈی ٹرینین ریجن" کہلاتا ہے۔ بحیرہ روم ترکی کے مغرب میں پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس حصے کو "آگین ریجن" کہا جاتا ہے اور یہاں کا سمندر آگین سی کہلاتا ہے۔ یہ آگین سی ایک تنگ سی آبنائے کے ساتھ گزر کر ایک نسبتاً کھلی جھیل میں داخل ہوتا ہے۔ یہ جھیل "بحیرہ مرمرہ" کہلاتی ہے اور اس کے گردونواح کا علاقہ "مرمرہ ریجن" کہلاتا ہے۔

استنبول کے پاس پہنچ کر بحیرہ مرمرہ دوبارہ تنگ ہو کر "آبنائے باسفورس" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ تنگ سی آبنائے دوبارہ ایک بہت ہی بڑی جھیل میں جا گرتی ہے جو "بحیرہ اسود" یا "بلیک سی" کہلاتی ہے۔ یہ بحیرہ کیسپین کے بعد دنیا کی دوسری بڑی جھیل ہے۔ بلیک سی کے آس پاس کا علاقہ "بلیک سی ریجن" کہلاتا ہے۔

ترکی کا شمال مشرقی علاقہ دشوار گزار اور بلند ترین پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کی سرحد جارجیا، آرمینیا اور ایران سے ملتی ہے۔ ترکی، ایران اور آرمینیا کی سرحد پر ترکی کا بلند ترین پہاڑ کوہ ارارات واقع ہے۔ جنوب مشرق میں ترکی کی سرحد عراق اور شام سے ملتی ہے۔ ترکی کے

مشرقی بلند پہاڑوں سے دنیا کے دو مشہور دریا دجلہ وفرات نکلتے ہیں۔ دریائے دجلہ براہ راست عراق میں داخل ہو جاتا ہے جبکہ فرات پہلے شام اور پھر عراق میں داخل ہو کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہ دونوں دریا جنوبی عراق میں بصرہ کے قریب خلیج فارس میں جا گرتے ہیں۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان کی وادی میسو پوٹیمیا کہلاتی ہے جس کا اوپری حصہ ترکی، درمیانہ حصہ شام اور نچلا حصہ عراق میں واقع ہے۔

بہتر ہوگا کہ ہم اپنے سفر کا نقشہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں تاکہ انہیں واضح طور پر ہر علاقے کے بارے میں علم ہو سکے۔

مصنف کا ترکی میں سفر

ہم نے اپنے سفر کا آغاز استنبول سے کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ پہلے ترکی کے باقی علاقوں کو دیکھ لیا جائے اس کے بعد آخری ایام استنبول میں گزارے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ استنبول پہنچتے ہی ہم یہاں سے 300 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹے شہر "بولو" کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد اگلے دن "سامسن" میں رات گزاری۔ تیسرے دن ہم "ترابزن" کی طرف روانہ ہوئے اور شہر سے 90 کلومیٹر دور ایک خوبصورت جھیل "یوزن گول" پر دو دن قیام کیا۔ یہاں سے ہم جارجیا کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے "کچکار" پہاڑوں سے گزرتے ہوئے "ارض روم" پہنچے۔ اگلے دن ہم نے ایران کی سرحد پر واقع "ڈوغو بایزید" کا سفر کیا اور کوہ ارارات کی سیر کے بعد واپس ارض روم پہنچے۔ اس کے بعد ہم "ارزنجان"، "شیواس" سے ہوتے ہوئے انقرہ پہنچے۔ انقرہ سے ہم نے "برسا" اور "الوداغ" پہاڑوں کا رخ کیا اور یہاں سے واپس استنبول پہنچے۔

ترکی کے جغرافیے کے ساتھ ساتھ اس کی مختصر تاریخ بھی اگر بیان ہو جائے تو اس کے مختلف

علاقوں کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ترکی کے اناطولیہ ریجن کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہاں پتھر کے زمانے سے انسان موجود ہے۔ بلیک سی کے اردگرد کے علاقے میں اب سے دس ہزار سال پہلے آبادی کے آثار ملتے ہیں۔ آسانی کے لئے ہم ترکی کی تاریخ کو ان ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

زمانہ قبل از تاریخ: 2500 ق م سے پہلے

کانسی کا دور: 2500 ق م سے 700 ق م

لوہے کا دور: 700 ق م سے 330ء

رومن بازنطینی دور: 330ء سے 1453ء

سلجوقی دور: 1071ء سے 1300ء

عثمانی دور: 1299ء سے 1923ء

ری پبلکن دور: 1923ء سے تاحال

''بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس میں ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔: اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر!''، (احزاب 33:68-64)

جب زندگی شروع ہوگی

ایک ناقابل فراموش داستان

زندگی کو بدل دینے والی کہانی

مصنف ابویحییٰ صفحات 267

- ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچادیا
- ایک ایسی کتاب جس نے اشاعت وفروخت کے ریکارڈ قائم کردیے
- ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا
- ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دی
- ایک ایسی تحریر جو اب ایک تحریک بن چکی ہے
- آنے والی دنیا اور نئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں
- ایک ایسی تحریر جو اللہ اور اس کی ملاقات پر آپ کا یقین تازہ کردے گی
- علم وادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

مصنف کی نظر ثانی کے بعد ناول کے تین نئے ایڈیشن شائع کیے گئے ہیں۔

جو کہ ’ماہنامہ انذار‘ کے قارئین کے لیے خصوصی رعایت پر دستیاب ہیں۔

اسٹوڈنٹ ایڈیشن قیمت 300 روپے

بڑی تعداد میں مذکورہ قیمت پر ناول حاصل کرنے کے لیے اس نمبر پر رابطہ کیجیے:

0332-3051201

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطلب

سنت اور پاکیزگئ دل

عن انس قال قال لی رسول صلی الله علیه وسلم یانبی ان قدرت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبك غش لاحد فافعل ثم قال یانبی وذلك من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی کان معی فی الجنة۔ (مسلم)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میرے پیارے بیٹے! اگر تو اس طرح زندگی گزار سکے کہ تیرے دل میں کسی کی بدخواہی نہ ہو تو ایسی زندگی بسر کر۔ پھر فرمایا: یہی میرا طریقہ ہے (کہ میرے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہیں) اور جس نے میری سنت (طریقے) سے محبت کی تو بلاشبہ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ جنت میں میتے ساتھ رہے گا۔

اطاعت رسولؐ کا صحیح طریقہ

جاء ثلاثة رهط الی ازواج النبی صلی الله علیه وسلم یسألون عن عبادة النبی صلی الله ولیه وسلم فلما اخبروبها کانهم تقالوها فقالوا این نحن من النبی صلی الله علیه وسلم وقد غفرالله ماتقدم من دنبه وماتاخر فقال احد هم اماانافاصلی اللیل ابداوقال الاخر انااصوم النهارابداو لاافطر وقال الاخر انا اعتزل نساء فلا اتزوج ابدا۔

فجآء النبی صلی الله علیه وسلم الیهم فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا اما والله انی لاخشا کم الله واتقاکم له لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النسآء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (مسلم عن انسؓ)

تین آدمی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آئے۔ جب انھیں بتایا گیا تو انھوں نے آپؐ کی عبادت کے مقابلے میں اپنی عبادت کی مقدار کو کم تصور کیا۔ کہنے لگے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا کیا مقابلہ، ان سے نہ تو پہلے گناہ ہوئے نہ بعد مین ہوں گے (اور ہم معصوم نہیں ہیں۔ پس ہمیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے) چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے لیے یہ طے کیا کہ وہ ہمیشہ پوری رات نوافل میں گذارے گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ نفلی روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے صاحب نے کہا: عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا، کبھی شادی نہ کروں گا۔ (جب آپؐ کو اطلاع ملی) تو آپؐ ان کے پاس گئے اور فرمایا: کیا وہ تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا: بلا شبہ مُں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں۔ لیکن دیکھو! میں (نفلی) روزے کبھی رکھتا ہوں، کبھی نہیں رکھتا۔ اسی طرح میں (رات میں) نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور دیکھو! میں بیویاں بھی رکھتا ہوں (سو تمھارے لیے خیریت میرے طریقے کی پیروی میں ہے) جو شخص میری سنت سے بے رخی برتے یعنی جس کی نگاہ میں میری سنت کی وقعت نہیں، وہ میرے گروہ مین سے نہیں ہے۔

(ایک بندۂ خدا)